

میں نے عطیہ کو کچھ نہیں بتایا۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔

اس کے باوجود میری طرح و بھی خوشی کے ایوان میں داخل ہو چکی تھی۔

اب زماں اور میں محبت سے رہتے تھیں۔

میں جانتا ہوں میرے لئے اب کوئی اور رکن کی بھی نہیں آئے گی۔ لیکن جب رات کے بچھے پر کوئی لڑکتی ہے اور جامن کے پتے گرتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں زندگے کہوں:

جب مجھے یقین ہو گیا کہ تمہاری خوشی کسی اور سے نہ استہ ہے تو میں چپ چاپ تمہاری

زندگی سے نکل جاؤں گا جیسے کھلے کوارٹ سے کیسے پترن کا دھول۔

لیکن یہ بات میرے منہ سے نہیں نکلتی — عطیہ میرے پاس آئی تھی ہے اور چپ چاپ

میرا منہ تک جاتی ہے۔

عطیہ ہمارے اصحاب پر اہم سے وجود، ہماری خوشیوں پر یوں چھاگتی ہے جیسے برپوش

چوٹیوں پر یخ بستہ ٹھنڈا —

ہماری زندگی نے عطیہ کا شہوتان لیا ہے۔ زماں اور میں نے مل کر عطیہ کا دہ بنت راشا ہے جو سونا تو کے بت سے بھی بڑا ہے۔ جولات و منات سے بھی زیادہ پُر شکوہ ہے۔ جو بده کے بت سے بھی زیادہ پر امراء ہے۔ اپریل کی راتوں کو ہوا ٹھہر ٹھہر کر چلتی ہے۔

اور جامن کے درخت سے سوکھے پتے چھڑکر پکے فرش پر گرتے ہیں تو تردپ کر کوئی

کوکتی ہے۔

میں کھڑکی میں بیٹھ کر زماں کا چھرو دیکھا ہوں۔ اس کے چھر سے پر اب ہماں کے دیے ہی داع میں جو بھی عطیہ کے چھر سے پنظر آیا کرتے تھے۔ مجھے اس کا سویا چھرو جاگنا نظر آتا ہے۔ میں زماں کی انٹکی پر کر عطیہ کے حضور جاگھڑا ہوتا ہوں.... اور پرلنے حساب چکلنے لگتا

ہوں...!

لتنے سارے سفر نے ایک ایسی محبت عطا کی ہے جو جن عطیہ سے تھی نہ زمبا سے ہے۔ لبک ایک  
ادھر ڈالی کشتی کی طرح ڈوبنے اور ابحرنے کے درمیان غلط دن رہتا ہوں۔ اس درد کی کوفتے  
نشاندہی نہیں کر سکتا۔ اس درد کے لئے کوئی ایٹھی بایو مک نہیں۔ کوئی دندر ڈرگ نہیں بنی۔  
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر عطیہ واپس آجائی اور زمبا افریقہ چلی جاتی۔ پھر تم دنوں  
اکٹھے رہتے اور میں — پھر بھی میں اس خوشی کو کبھی چھوڑنے سکتا جو زمبا کے آنے سے پسے  
ہماری تھی کبود نہ تھبے زندگی کو واپس نہیں کئے جاتے یہ سو دلوں کے لئے نہیں خریدا جانا۔  
ٹاہے پچھلی جنگ میں جب جا پانیوں کے افکر کچھ جنگی قیدی آجاتے اور انہیں سخت  
ترین مزادریاً مطلوب ہوتا تو قیدی کے سر کے بال منڈھرا کر لے ایک ایسی ٹوٹتی نئے باذ ہو کر  
بٹھا دیتے جس سے قطرہ قطرہ پانی کی بزندگی اور اس کے گنجے سر پر تواتر کا سخون ڈا رتی۔  
یہی ایک بونداں کی بلاد کت کا سبب بن جاتی۔

زمبلے مجھے وہ سب کچھ دیا جس کی کوئی مرد خواہش کر سکتے ہے۔  
علیہ نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو ایک عورت کسی کے قدموں میں پچاہو رکر سکتی ہے۔  
میں نے ان دونوں سے ویسی ہی محبت کی جسکی کوئی ہمند رکرتا ہے اپنے پرانے پانیوں سے  
اور اپنے نئے پانیوں سے۔

ہم تینوں نے کچھ نہیں کہا۔ کبھی ایکد مرے سے نفرت نہیں کی، کسی پر لازم نہیں دھرا۔  
ہم نے محبت کے ذہر سے ایکد مرے کو ختم کر دیا۔

پانی کی ایک ایک بوندے،

قطرہ قطرہ پنکا کر .....



جی اور مجھے بھی جینے دے۔ ایک یار چوڑ دس یار بنا۔ پر مجھے آلام سے رہنے دے۔ کہیں بھوپال پک  
نہ بھی رہے تو میں کیوں مردی غیر کی اگل میں بل جل کر۔ ایسا ہی جو تجھے مجھ سے پیدا ہے تو ایک بد  
میری خاطر ہی کسی غیر کے ساتھ سورہ۔ پھر تو مجھے کچھ کہنے جوگی تو نہ رہ جائے گی۔ بعد میں تم دونوں  
برابر ہو جائیں ایکبار۔ ایک دفعہ سچا تو پیار ہو ہمارے درمیان — سچا پیار۔

رات کا کچھ پلا پھر تھا۔ صبح عید میلاد النبی تھی۔ یوں تو عالم طور پر اس وقت رات کو چھپی  
گئ جایا کرتی تھی پر آج بازار سے بھوپور پر فیض پڑھنے کی آواز اب بھی آرہی تھی۔ شریفان بارا  
مر جھشکتی، کافنوں میں انگلیاں لیتی پر نہ جانے کیا بات تھی لاڈ سپکریوں سے ماہی پڑب والے  
کے حصنوں نہ راہ مکفیدت کسی موڑ پر کسی جگہ رکتا اور تابے کی آواز نعمت کی جگہ رات کی خاموشی  
میں گرجتی:

”پھر تو مجھے کچھ کہنے جوگی تو نہ رہ جائے گی بعد میں۔“

”ایسا ہی جو تجھے مجھ سے پیار ہے تو ایکبار میری خاطر ہی کسی غیر کے ساتھ سورہ۔“

”تو نے اپنی شرافت کی دھونس دے دے کر میری زندگی میں نہ گھوول دیا ہے۔  
قافیہ زدیف کی قید سے آزاد یہ کلام اتنا ہی اونچا تھا جتنی کسی عقیدہ نہ کی آنسوؤں سے  
بیٹگی آواز۔“

ابھی تک تابے کا ٹرک مسجد کے پچھے احاطے میں نہ آیا تھا ورنہ یہاں تک اس کے لیے دیکر  
ٹرک بند کرنے کی آواز تابے سے پہلے آئی۔ اس کے دلیں ہاتھ پچھلی تریفک دکھلنے والے آئئے  
کے ساتھ ہمیشہ ایک سیاہ موباں بندھا رہتا تھا۔ جب یہ ٹرک متھے اور پر جلنے والی کاروں کو بھی  
کوئی کر کے سیدھی ٹرک پر لگے نکلتا تو یہ موباں گویا ما قہا ہا بلکہ تیچھے رہ جلنے والی گاڑیوں کو  
اوداع کرتا۔ ٹرک کے پچھے تختے پر آتشی گلابی بچوں کی بیل کے اندر خدا حافظ کے اور پر لکھا تھا:  
”جلئے والے جلا کری۔“

خدا جلنے تا جا کس کس سے یہ کہہ چکا تھا؟

شریفان کو اب شہبہ ہو رہا تھا کہ اب تلبے کو خدا کبھی گھر نہیں لائے گا۔ نشی میں بڑھی ہوئی  
شرمنی آنکھیں قیمعن سے ذرا سنبھل مٹکتا ہوا ازار بیند، جیب میں درمسے شوکی مٹکت کا آدھا پھٹا  
ہوا حصہ اور مریں نہ جانے کس کے خواب؟ اب شریفان کو یہ لگتا تھا کہ جیسے تلبے کی رہنماد گوئند  
میں سے جو ادمی رات کو پچھے پیر کرتا تھا شاید وہ بھی آج نہ آئے۔ اسی خیال سے باری کے بھاری میں  
جیسے اس کا جسم لرزاتھا۔

کل سولہ سیڑھیاں تو تھیں۔ پرانی شریفان ہوئی تو دو چار دشگے اور کرنپے صحن میں جا پہنچی۔ پہ  
اچ تو دو لوگوں کی بنی ہوئی الڈی تھی۔ پہنی سیڑھی پر بیٹھی کبھی ماہنی کریدنے بیٹھو جاتی کبھی مستقبل کروانے  
لگتی۔ اسے اپنے باپ کی باتیں یاد کریں :

”بیٹا۔ ساری خلفت یا تو مانی کے لئے روتی و حقی ہے یا مستقبل کے خابوں کیلئے پریشان  
رہتی ہے۔ اصلی خدا کا بندہ وہ ہے حال میں زندہ رہے۔ آج کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے۔ مستقبل  
کے لئے پریشان ہونے مانی کا اختساب کرے۔“

شریفان کا باپ پڑھا لکھا تو نہ تھا پرلاںس باغ کی مسجد کے پاس گلاب کے تختوں کی گردی نہیں  
کرتے کرتے خدا جانے کیا کیا اس کے کام میں پڑتارہ رہا تھا کہ اس کی زندگی و حموئی کے دھلے ہوئے  
کپڑے کی طرح کلف زدہ، استری شدہ اور بے داغ تھی۔

جب پہنی بار شریفان کا بھائی گلزار بڑے ہو ٹھیں لفت گیری کرتا ایک دن شراب میں غذ  
کھرا ہے تو اب کے کھودرے ماقلوں پر سارے دشگے کھڑے ہو گئے۔ ماں ہاں کرتی رہی لیکن ابا نے  
کھوپی کا ایک ہی وار ایسا کیا کہ بازدار گاؤشت پچاڑ کر بڑی تک اتر گیا اور لموشانہ سے نکلنے لگا۔  
ماں میں اتنی ہمت تو نہ تھی کہ ابا کے سامنے لے لعنت مامت کرتی پر جب گلزار کی پہنی  
بندھر چکی اور وہ اسے گرم گھی اور دودھ پلاچکی تو اسکتے ہیئتے چلتے پھرتے اماں کے منہ سے ایک ہی  
بات نکلتی :

”میرا گلزار کب پیے والا تھا! روز ہی جو اس کے دامغ میں ایک ہی خیال بھنسے والوں نے

جہس دیا تو آخر انسان تھا، پینے پر آمادہ ہر ہی گیا اُو۔ اس نے تو کبھی سالن کے ساتھ کچھ پیاز نہیں کھلے بُوکی دبھ سے۔ وسکی اور سوڈے سے کیا غرض اسے! پر ساتھیوں نے قسمیں دلا دلا کر صبح شام سراہندی پواندی عبیث بدیو کر پیشان پڑھائیں۔ ادمی کا بچہ کب تک کنارے بیٹھا رہتا۔ اُو کو کپڑے میں لڑک گیانا دان۔

اصل واقعہ خدا جانے کیا تھا لیکن جب چرتھے پانچویں گلزار بولنے جو گاہ تو اس نے ساری باتیں شریفان کو بتائیں۔ کماں تو شریفان نے اس کے کرے میں جانا ہی چھپڑ دیا تھا۔ اب کھتی کی گیند ہی بہیشہ اسی کے کرے میں بیٹھی رہتی۔

ساری گلی میں صرف گلزار نے پانچ منزلہ مکان ٹوپر پیر ائمہ کنڈیشنا فائوساہ ہوٹ اندر باہر سے دیکھا تھا۔ وہ اس ہوٹ میں معمولی لفڑ میں تھا اور کئی سیاسی لیڈر، مشہور علمی ایکٹر میں انگل گول چیزوں والے سرکاری افسروں لفڑ میں وبی دبی ڈکاریں یا کرتے تھے اور جو سب کے سب تباہی معدہ کے ملزیں تھے، بہت قریب سے دیکھتے تھے۔ جب شہزادہ کی معروز، مقدار اور صاحب اقتدار ہستیاں اس کے ساتھ لفڑ میں بعد ہو جاتیں اور وہ اپنی ٹینگنگ کے مطابق انکریں صرف بننے پر کھتنا تو اس کے کان مائیکروفون کی طرح تیز ہو جاتے۔ چھ مینوں میں اس کی کئی تدریں پر پانی پھر گیا کئی باقیں جو اس کے نزدیک بڑی معیوب تھیں اب قابل تحسین ہو گئیں۔ کئی باقیں جو قدام تھیں تھیں اب مفعکہ خیز نظر آنے لگیں۔ چھ ہی مینے میں اس کا حال بالکل ایسا ہو گیا جیسے دستانہ اندر سے باہر کر دیا گیا ہو۔

لیکن امیر لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کے باوجود ایمیز فرشنر سے شکفتہ بند ہوٹ میں ہے نے کے باہر گلزار تھا بہت پرانے خیالات کا آدمی۔ کچھ باپ کا خوف غالب تھا کچھ پیپن کی ٹینگنگ میں حرام حلال کے درمیان بار بار اتنی گری کھائی خود کی گئی تھی کہ بیکارہ BASEMENT میں کھانا کھلنے جاتا تو چپ چاپ نظریں ملائے بغیر کھانا کھا رہا جاتا۔ پرانے تو دہمن کا گھنڈہ ملٹا ہے اور آدمی آدمی سے بات کرتا ہے بیرا بارادی، دھونی، بندکر قم سروں والے روز منٹے لگے اور اُسے

وردی میں چھپے ہوئے چرولی اور سمازوں کی شناخت ہونے لگی تو بالطف بڑھے، بے نکھیاں پیدا ہوئیں اور خدا بخش، قادر اور یارِ محمد کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنے لگی۔ ہوش کے اوقات کے بعد وہ تینوں اکٹھے ہی اس کے ساتھ ہوش سے نکلتے اور بعض وردیاں پہنچ کے وقت بھی کیوں میں وہ عموماً اس کے چیخھے ہوتے۔

یہ تینوں بدیسی مسافروں کو بست اپنڈ کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں DRINKS پلایا کرتے۔ خدا بخش بھوری موچھوں والا کا کیرا حسین قسم کا جوان تھا اور مالا کندھ سے آیا تھا۔ قادر کا پیپن سندھ میں گزرا اس نئے وہ جی سائیں اور انشادِ اللہ کا استغفار بہت کرتا۔ یارِ محمد کے کچھ دھوپے آپھے تھے اور وہ کبھی کبھی دانت کے درد کا ردنابھی روایا کرتا تھا لیکن تھے تینوں یارِ زندہ صحبت باقی قسم کے فرد۔ بڑی سے بڑی انکواری کو بچ سمجھتے۔ جب میر کی بوتوں پر گھبلا پڑا اور سٹور کی انچارچے اطاولی میڈم نے سامے ملازموں کو فوال ان کرایا تو ان تینوں کے عداد سب کے چرولی پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں حالانکہ میر کی بوتوں نیچے کھیت انہوں نے غتر بود کی تھیں۔

جب بھی خدا بخش و سکی کو منہ سے لگاتا تو ایک ہی بات کہتا:

”خدا قسم! گلزار تم بے نصیب اے۔ تم ایک دفعہ پیدا ہو لے ہے چسپکی کی زندگی بسر کرے گا اور چھپے کی موت مرے گا۔ ہم شیر کی زندگی بسر کرے گا اور شہید کی موت مرے گا۔ سینے پر گول کھا کر۔ تم تو زنانی بے زنانی۔“

قادر شہباز قلندر کی قسم کھاتا۔ پھر یہ ہوں شرفیف کے گھر سے پانیوں کی یاد کرنا اور حاملہ بور تو کی طرح اب کافی لے کر کہتا:

”پلے یار گلزار، میری خاطر پلے۔ سارا گناہ خدا قسم میرے سر۔ میں تجھے اللہ قسم کیسے بتاؤں میرا پیر کتنا ملکھا اے۔ یہ تو شراب ہے جو قتل تجھی کر دے تو بخشنواںوں پسی سر کارے: سب سے چاڑھچڑی کپکے بالوں والا یارِ محمد تھا وہ موچھوں کو زبان سے چاٹا ہوا بولتا: یہ ہمیں شرمذہ کرتا ہے خدا بخش! ہمیں سمجھاتا ہے کہ یہ آتنا اونچا ہت اور مم...“

یہاں ہیں، یہاں!"

وہ ایک مانچہ آسمان کی طرف اٹھاتا اور دوسرا پیر دن کی طرف۔

جس روز گلزار شراب پی کر گھر آیا اس روز نیو ایپریول سے تھا۔ گلزار گھر کہہ گیا تھا کہ وہ دیسے آئے گا اس لئے سب جلدی سو گئے اور ان نے اس کے لئے کھانہ رکھا تھا۔ جب رات کو توپیں دیگیں، ناچ دالے ہال میں زور دوسرے تاش بجے، بتیاں بچا کر سارے لوگوں نے اونچے اونچے شراب کے پیالے اٹھائے اور ہیپی نیو ایپریول کے لفڑے من کر گلزار کے لoun کندھے کھڑے ہو گئے تو اسے لٹا کر داتھی نیاسال خوشیوں کے پالنے میں جھوٹنے والا نوزادہ بچہ ہے جو اسکی آغوش میں پھٹے پھولے گا۔ سارے ہال میں مسکرا ہیں تھیں، موسيقی تھی اور شراب کی خوشبو تھی۔ ایک بار ان کچھ انجینیئر چھا بے میں رکھ کر بھول گئی تھی۔ صبح سارے گھرستے ایسی ہی خوشبو کے جھلک کے لختتھے اب گلزار کو یہ پینے پلانے والے بہت عصمرم نظر آنے لگتے تھے۔ وہ روز روز یہ منظر دیکھ کر اس کے ساتھ گناہ کا تصور لانا بھول چکا تھا۔ خدا بخش، قادر اور یارِ محمد ولیے بھی پینے پلاتے لے گئے تھے یہ اور بات تھی کہ اس نے کبھی خود شراب کو منذرہ لگایا تھا۔

اس روز BASEMENT میں بھروسوں کے انبار کے یچھے جب خدا بخش رُکھردا کر لوتل اس کی طرف لے کر بڑھا تو گلزار انہی اندر رز گیا۔

"یارِ خود ری سی ہیو۔ ایک دفعہ دیکھو تو سی کیا مزہ ہے۔ اس کا مزہ چکنے بغیر ہی مل جائے گا ظالم!"

گلزار دو قدم یچھے ہٹ گیا۔

"مت کو اسے پینے کو تمارے کہنسے یہ ان سکتا ہے؟ یہ میری مانے گا۔ لوگلزار!

اچھے پی لو۔ یہ کبھی مانچہ نہ رکانا۔ خدا قسم! تے مال کا شکون ہے۔ پی لے میرے یہاں!"

"مت کو اسے۔ جانے دل سے جنت ہیں۔ بننے دو ہیں دوزخ کی آگ۔ یہ یار دل کا یار ہی نہیں ہے۔ اس کی چادر میلی مت کرو۔ جا یعنی گلزار لفڑ چلا جا کر۔ ہم بیرا برا دری میں کھیں

آگیا ہے دوزخیوں کے پاس:

خدا جانے کی بات تھی پر اب یار محمد تھوڑی سی بیک اینڈ والٹ چڑھا کر سکنے لگا اس پر عجیب قسم کی ندامت و پریشانی اور زور بھی طاری تھی۔

"میں تمہارا دوست ہوں یا ر محمد" گلزار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"پلید ادمیوں کا کون یا ر ہوتا ہے گلزار میاں۔ ہم تو درون کے قابل ہیں۔ دوزخ کی آگ جلتی ہے ہمارے ہسپوں سے۔ تجھے جنت کی ہوا میں راس آئیں۔ اللہ عاش رکھے تجھے۔ تیرا ہا رکیا ساخت،... جلنے والے دوستو خواہ مغواہ"

یار محمد اپنے سفید بالوں سمیت چھوٹے بیجوں کی طرح روٹے لگا۔ گلزار اس کے پاس بیٹھ کر بڑی ندامت سے سمجھا لے گا۔ "خدا کے نہ مت رو دیا ر محمد، میں معذور ہوں میری طبیعت نہیں انتی۔ میں نے اب تک کبھی اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ مجھے معلوم بھی نہیں کہ اس دود کا منہ کیسی ہے مجھے اس سے ہبک آتی ہے۔"

یار محمد خود ترسمی کے کنوئی میں اور گر گیا۔

"یار ذل کے یار وہ ہوتے میں جو ابھا نہیں دیکھتے۔ جو پوچھتے نہیں کہ کیوں اور کیسے... جو بن پوچھتے پھاشی چڑھتے ہیں۔ پر ہمارا کون دوست۔ ہمارا کون سایار؟"

"میں تمہارا دوست ہوں۔" گلزار پر نیو ایٹر کی رات کا عجب کیف اور سا اثر تھا جیسے نہ سالے اس سے خوشیوں کا وعدہ کریا تھا چکے چکے۔

"میں تجھے نہیں کہتا کہ پتیدہ۔ ہماری طرح عادی ہو جا اس کیتھی چیز کا۔ میں تو تجھے کبھی بر بادی نہ ہونے دوں اس بد سخت کے لئے۔ پر ہم سا دنچارہ کر تونہ سوچ۔ ہمارے پاس تو برا بیوں کی سونات ہے۔ گو دوست ہے تو ایک بار منہ لگا۔ ہماری سطح پلا جا۔ پھر چلے گا پس چلا جانا۔ ہم تیری لگا ہوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تیرے ساتھ رہ کر ہمیں اپنے آپ سے جو آتی ہے۔"

پھر یار محمد پر روٹے کا دوڑ پڑ گیا۔

جب سے گلزار اس منڈی کا سر پہنچ ہوا تھا شراب پینا گناہ تو رہا ہی نہ تھا۔ لیں ایک رکھی  
گئی تھی، ایک جھجک سی تھی جیسے کندھی سیدھی لگی ہو۔ دلیں بائیں موڑ کر مغبوط نہ کی گئی ہو۔ ذرا سا  
دھکا لگے اور کھٹ سے آپی آپ کھل جائے۔ — جب گلزار نے وسلی کا گلاس ہاتھ میں لیا تو وہ  
مرف پسندے دستوں کو خوش کرنے کی آرزو دل میں رکھتا تھا۔ ان تینوں کی رنگاں میں اس پر جمی ہوئی تھیں۔  
گلزار کے کافلوں میں یہ پی نیوڑا یز کے لفڑے اور زور زور سے تلشے بننے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے  
ایک بسی ڈیکیں میں آدھا گلاس چڑھایا۔

تینوں دوست اس سے پٹ کرنے تھا شال سے چونے لگے۔ گلزار کی آنکھوں کے عین تیچے مدب  
شیشے میں جو دو موئینیاں روشن تھیں وہ ان بوسوں کے ارتقاش سے بخوبی گئیں۔

عید میلاد النبی کی وجہ سے ابھی بھی بازار کی طرف سے لاود پیکر پر بخوبی آوازیں کوئی کا

رکھتا۔

کھتہ ہر علی، کھتہ تیری شا  
گتاخ اکھیں کھتہ جا لڑیاں

شریفان اوپر والی بیٹھی پر بیٹھی تھی۔ تیچے سولہ بیٹھیاں اتر کر صحن میں زیر و کا بلب جل رہا  
تھا۔ اس کی روشنی میں چنبی کا بوٹا ٹوٹے ہوئے کھنڑتیں میں اکھڑا اکھڑا بکھڑا تھا جیسے گھر جلنے کی اجازت  
طلب کر رہا ہو لیکن دل ہی دل میں ڈرتا بھی ہو۔

شریفان کا دل ہر قسم کے دکھ سے خالی تھا۔ بارش کے بعد حصے ہوئے آسان کی طرح ایک بھی غم  
اس کے دل پر نہ تھا اور پھر بھی دل تھا کہ پنی ہوئی چاچک کی طرح بالکل خالی ساختا۔ آج اسے ذرا فکر نہ  
تھی کہ اگر مڑک کی کمیں مٹکو ہو گئی تو کیا ہو گا۔ اس کے ذہن میں تلبے کے تیز رفتار مڑک سے اسکا  
تعلوں ٹوٹ چکا تھا۔ تلبے کو تو شروع دلنے سے اس سے محبت نہ ہوئی پر جو یک طرف ڈریں کہ شریفان کے  
دل کی طرف سے جاری تھا۔ بھی یکدم بند ہو گیا۔

تمباخ نے بڑے ترے منڈی سے شریفان کے ساتھ شادی کروائی تھی۔ شریفان کا باپ تھا تو

وہ نسیں گارڈن کا مالی پر ساری برا دری میں اس خاندان کی بڑی دھوئی دھانی سی عزت قائم تھی تابعے کے وکل کا صرف ان رشتہ داروں پر کچھ رعب نہ گھستا تھا۔ تباہے کی اس نے بڑی لڑکوں کے نام گینوائے پر تباہے کے دل میں تو ایک ہی شریفان کی تیسی گان خدھ پڑ گئی تھی۔ شریفان کو پسند کرنے کا پہنچ کچھ اتنا ذمہ اٹھا تو نہ تباہے کو متاثر فرود کر گیا تھا۔

بین خورشید کے منجھے بیڈے کا عقیقہ تھا۔ خوب ذات برا دری کا اکٹھ ہوا۔ تین دیگیں پلاویکی اور ایک دیگر زردے کی اڑتی تھی۔ تین چینی کی تھاں میں میسی میسی اشے ہوئے پلاویک ایک بلوٹ اور رونگی پیالوں میں دو دو اسے ایک بلوٹی کا صاحب لگا کی خورشید پڑھی پر میٹھی تھی۔ براڈن پانش سا اس کارنگ اس پیلے سے تباہا تھا۔ وہ حصے باشٹی جاتی تھی اور گھر کی جوان لڑکیاں بیک جھپک کر پلاویکی پہنچیں اور پیالے اندر ہماں کو پہنچا رہی تھیں۔ شیکے ہمئے دستر خداوند پر جا بجا چاول بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے خدیں کر رہے تھے۔ جو تینیں آتشی گلبان، اگرے فیر دزی اور طویلیا ہرے رہنگ نائلوں کے صروں پر سے کھکتے دو پڑے سنبھالتی پلاویک شور بہ کھانے میں مشغول تھیں۔

فرش پر بکھرے ہوئے چادوں کے مارے شریفان پہنچوں کے بل چلتی تیر دیز خورشید تک پہنچتی اور پھر تھالیاں اٹھائے اندر سیلے کمروں کی طرف چلی جاتی۔ ایسے میں جو ایک بار گزری تو تاجادر را کے پاس کھڑا تھا۔ چلتی چلتی راکیوں سے بھر کر گزر جانا اس کا معامل تھا۔ شریفان کے چھوٹے نے نک پر پسینے کے نہنہ نہنے بوریں قطرے تھے۔ اور والے ہونٹ پر ایک ابھروں ساتھ تھا۔ انکیں چیتے کی طرح زردی ماں اور بالوں کا رنگ جھوڑا تھا۔ کاون میں پلا شک کے بندے اور کلائیوں پر کافی تھی سرخ چوڑیاں تھیں۔ شریفان کی سجاوٹ کچھ پسپنے طبقے کی سستی اور معقولی نہ بیان سے مختلف نہ تھی لیکن ناگوں کے کپڑوں اور پلا شک کے زیوروں کے باوجود وہ اس سارے نجیع میں بڑی علیحدہ قدر اور فمارانی سی گگ رہی تھی۔

تاجا شریفان کو دیکھ رہو بک سا گیا۔ ہمیشہ سے وہ ایک ہی مقولے پر عمل کرتا تھا کہ ہنسنی اور ہپنی یعنی سی کوئی بتا، کئی گھسے پڑے لیسنے۔ دیدہ ولیری، کئی دھوپی پڑے اسے یاد تھے۔

پر اب شریفیاں کو ہنسانے کے لئے وہ بالکھ سوچتا رہا لیکن جتنی بار شریفیاں رناٹے سے گزرای اتنی، ہی بارہہ دہیز میک پچھا اور پھر راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

خود شید کے بیٹھے کا عقیقہ کیا ہوا تھے پر تو شادی کا بھوت سوار ہو گیا۔ پہلے جب کبھی دہی نہ لے کے کنارے پر سے بُری بھر کر اپنی ٹرک میں لایا کرتا تو یہی خواہش کرتا کہ ساری عمر شادی نہ ہو۔ گجرات میں اس کے کئی مخلانے تھے۔ گوجرانوالے میں اس کی کئی دعفیتیں تھیں۔ امین آباد، وزیر آباد، گلور، سیالکوٹ، جہاں کیسی بھی دہ جاتا خدا جانے کیسے اس کے گرد کہانیاں ہی کہانیاں پڑ جاتیں۔ تھے کی کاٹھی بڑی خوبصورت تھی۔ اور پر کشمیری رنگت اور پٹھانوں جیسی مضبوطی۔ ندبی کھٹے کھجھے جیسا تھا۔ اگر پہنچت کوٹ پہنادیا جانا تو کسی فارم کا ولن نظر کے لگتا۔ اب بھی سفید شلوغیں کے اور پر گلے میں مظہر دلے اور راتھے پر باؤں کو کھلائے پھر ٹرکے کی در کو کھٹکھٹا تا تو اندر کھڑکیوں اور کوڑوں کے یچھے سے رُکیاں اسے ایک نظر مزور دیکھتیں۔

شریفیاں سے شادی ہوئی تو اس کے کچھ یہ معنی نہ تھے کہ تا جانشنا کا گھائی ہرگیا تھا تا نہ کے دل میں بیوی اور گھروالی کا ہونصور تھا اسی تصور پر ..... ایک سے زاریوں کی طرح شریفیاں فٹ آتی تھی۔ جب تلبھے نے شریفیاں کا گھنڈا اٹھایا تو شعلہ پوری نہتھ کے لے کر پہشت میں دکھا چاند دیکھ کر تا جا کچھ دیر کئے لگا۔ پہنچا بیٹوں کی ایکیسریوں کی مانند شریفیاں بڑی صحت منداور جی دار نظر آئی اور تا جاتوں میں تین تین شودیکھیں والا شوقین نہماں بڑی طرح شریفیاں کے درپے ہوں۔

لپنے طور پر اپاراپی سمجھد بوجھ کے مطابق تلبھے نے شریفیاں سے بڑی بھرپور محبت کی لیکن منکرِ زالقہ بہ نے کئے باطلہ نقل جب کبھی وہ ادھر ادھر دل گکا بیٹھا اور شراب کے نشے میں شریفیاں کو حاد سے حالات بھی بتا دیتا تو بڑی مرد جنگ گھر پر جاری ہو جاتی۔

شریفیاں ٹھنڈی قلاغی بن جاتی۔

دوسرا دل دہی الی الصع اذار بعد بننے کا اڈا دیوار جسکے ساتھ گا کر بیٹھ جاتی اور اس کے انگوٹھے

انگلیاں اسی تیرزی سے تلنے بلنے میں سے گزرتے کہ لگتا چھوٹی چھوٹی پھر پاں دھل گئے بچا کر نکلتی جا رہی ہیں۔ شروع شروع میں تو نما جا پریشانی کے عالم میں دب کر باہر نکل جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے اس خاموش جنگ سے چڑھو گئی۔ اب وہ گلے میں ریشمی مفلر پیٹاۓ چھوٹی موٹی جنگل کے بغیر ڈرک کی چابی طاق سے نداھاتا۔

”کیا صحیتی ہے تو اپنے آپ کو؟“

شریفان سو اسو اچی پکیں اٹھائیں اور پھر جھکائیں۔

”بازاری عورت تھی وہ۔ پیسے می شے تھے میں نے ہوا میر انگور خردیدیا دیے۔“

شریفان اب بھی انگوٹھے چلاتے جاتی۔

”تو بولتی کیوں نہیں۔“

”کیا بولوں۔“

تمرا خیان ہے کہ کہیں تجھ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تیرا خیال ہے کہ تیر سے منہ بنانے سے بات بدل جائے گا۔ طبیعت میں فرق آجائے گا میری۔

”میں یہ کب کہتی ہوں۔“ شریفان آنسوؤں میں بھی گئی اواز میں بولتی۔

” تو کیا کہتی ہے تو۔ میں کوئی دوسرا کا ح پڑھونے جا رہا ہوں جو تو بآخر بھلی نہیں ہے۔“

اب شریفان کے آنسو پٹ پھٹ زانوں کے شر میں جذب ہونے لگتے۔

”مجھے دھوں اچھی نہیں لگتی شریفان۔ خدا قسم تو مجھے ان آنسوؤں کا رعب نہ دیا کر جو تو بھتی

ہے کہ میں دبکے میں آجائیں گا تو غلط خیال ہے تیرا عورتوں کے لئے اپنا طریقہ بدنا مردوں کا کام

نہیں۔ ہا۔“

چھوٹی چھوٹی جنگلوں کا نیجہ یہ لکھا کہ آہستہ آہستہ دیگوال لگنے سے شریفان کا پالش بھی انکھوں گیا۔

پسلے وہ بیان میں لکھ کرنے لگی:

”جانلبے۔ دیکھی ہوئی ہے تیر کی محنت، رہنے والے جانی پھر و کہبڑے۔ کوئی اثر نہیں تھا۔“

ان سو نا توں کا مجھ پر۔ محبت کوئی ان باتوں سے تھوڑی ہوتی ہے۔  
تاجا بسلاک اپنی دکالت کرتا:

مکیا کروں شریفان۔ بری عادت پڑ گئی ہے۔ اچھی عورت دیکھ لوں تو پھر ادگر کچھ نظر  
نہیں آتا جھے۔ خوب پتا ہوتا ہے کہ لبسوں کی وجہ پر ہے پر جب دل میں جھلار اٹھتی ہے تو داماغ کام  
نہیں کرتا۔ بول، میں کیا کروں ی تو خواہ مخواہ دل نہ میلان کیا کر۔ دل میرا تو سدا بھارتی رہے۔  
ان جنگوں کے بعد سرزنش اور دھکیوں کا درساں۔ یہ کے جانے اور زہر کھانے سے لے کر قتل  
کرنے والے اور خاندان والوں میں حالات نشر کر دینے کی باتیں جب چل لکھنیں تو تاجا بھی چھٹی آندھی  
کی طرح بھر جاتا۔

نے میں کوئی ڈرتا ہوں کسی سے۔ تو میاں جی کو کیا سارے شہر کو بننا۔ ریڈ یو پاکستان کی کوشش  
سرنوں میں نکلوادے کرتا جائے ایمان ہے۔ ہری چک ہے۔ دوسرا عورتوں سے اس کے تعلقات میں  
کہو سے، کہہ دے سب سے۔ میں کوئی ڈرتا ہوں تجھ سے۔ میرا اپنا ٹرک ہے کسی سے لے کر کھانا  
ہوں میں کسی کی کمائی کا استر ہے مجھے۔

زادائی کی بینگ جب خوب چڑھ جاتی تو تابے کی ٹھرف سے پسپائی کا رانگ ظاہر ہونے لگتا۔  
دیکھ بیلی توک کیوں ٹہیاں ترڑوائی ہے اپنی جتنی ساری کھے میں کھاتا پھرتا ہوں اس کا بو بھر  
تجھ پر ڈالوں تو تیری ہڈیاں چور ہو جائیں۔ سمجھ تو سی۔ کم بخت۔ اپنے ہاتھوں پر کاچ کا بترن تو ڈالوں۔  
اس رُدائی جھگڑے کا درٹھنڈا پڑا تو شریفان بڑی نہایتی ہو گئی۔ ترٹ کے غماز پڑھ کر وہ سات  
بار سورہ اناس پڑھتی اور جب تابے کے چہرے پر پھونک مارتی تو تاجا جارضانی کے اندر رہت  
کر کے کھتا — ”نہ کری جا جاؤ۔ نہ پھونکیں مار میرے اور پر۔ رہنے دبے میرے لندشیطاں  
کو رُدائیں ملتا ہے اسی سے رضاۓ جسیا“

جماعات کے جمعرات گڑ کے چاروں پکا کروہ بچوں کو کھلاتی۔ گیارہوں شریف کی نیاز اسے باقاعدہ  
وہی جانے لگی۔ مسجد میں ایک دیا بھی اس کے نام کا درشن ہو گیا۔ قرآن شریف کی چویں نے آنسوؤں کے

کھاری پانی کی وجہ سے رنگ چھوڑ دیا یا لیکن، بنانے والے نے جب تکہے کا رنگ نہ بدلنا اور کوئی نصیحت لے نہ کرائی تو شریف ان کو دیکھ کر ہری بیل میں مسون کھجھے بیول کی طرح لٹکتی رہ گئی۔ اب اٹھتے میختے بلے ہو کے، اسرد سردا آہیں، اروٹی روٹی سی اسکی تھیں۔ چال میں عجیب طور پر صیلان سا آگیا۔ چھپے پر وہ تازہ سبب کی سی چمک نہ رہی۔ اور پر لے ہوئے کا تل اب کلمجی مائل بیوں پر نظر بھی نہ آتا۔

جب شریف ان تکہے کو میں لائیں پر مناسکی تو خود گھٹتے لائیں لگ گئی:

”کیا ہل ہے تجھے اب؟“

یہ سوال کئی بار تا جا پہنچتا اور کچھ خود ہی جواب دے دیتا: ”میرا ہی قصور ہے سارا مذہب تما تجھے اپنی باتیں۔ چکے چکے دودھ ملائی کھانے والی بی اچھی۔ جھونک جھونک کر رات کھانے والا اکنڈا بُرا خود کھلاتی ماری میں نے اپنے پاؤں پر۔ خود شمن بنایا میں نے تجھے اپنا سارے مروبا ہر جا کر جو کچھ کرتے ہیں کوئی گھر اکر تھوڑی کر توت بنا دیتے ہیں یوں کو۔“

شریف ان دونوں بس بچ پر جانے کے خواب دیکھتی رہتی۔ محلے میں جو بھی عورت جو کرائیں اس کی درست بن جاتی:

”شریف ان۔ کئی میں تو اللہ کی حاضری ہے پر وہ مبارک کو جب دیکھے گی تو غش کھا جائے گی۔ کامی کمل کر لے کے دربار میں تو کوئی دکھ رہتا ہی نہیں جی کو۔ سب کی سنتا ہے وہ۔ سب جانتا ہے وہ۔“

کوئی جنم مقام ابراہیمی کی باتیں کرتی۔ کوئی مذاکی سناتی۔ کوئی جدہ کے سفر سے شروع ہو کر والپس جدہ تک پہنچتی۔ شریف ان نے دل ہی دل میں کئی باشیطان کو کنکریاں بھی ماری تھیں۔ پرشیطان اتنی چھوٹی لکنکریں سے مانتے والا تھوڑا ہی تھا۔ وہ تو کوہ سفید میں بھی دب جانا تو کسمی نہ مانتا۔ ان ہی دونوں جب بہشتی زیور، یازدہ شریف اور تیزیں اس کی زندگی کا حرز دہری۔ وہ بھی بیوی آہوں کے درمیان کھبھی کھبھی تباہے کو نصیحت کرنے لگتی:

”تابھے مجھے چھوڑ، میری خاطر نہ می اپنی خاطر یہ بے جیانی چھوڑ دے۔ خدا قسم بڑی سزا“

لے گی تجھے۔

”کوڑھی ہو جاؤں گا۔ آٹھاکھار دگ ہو جائے گا مجھے۔ ہونے دے میں مزاں نہیں دڑا  
بادام کھلتے اگر راست ٹوٹ جائیں تو کہاے کا درد۔“

عبد میلہ واللبھی سے پہنچے کا ذکر ہے کہ تاجا بھری کا ٹرک گلبرگ آتا کر آیا۔ نہاد حور جب  
وہ کھانا کھلنے بیٹھا تو شریفان اس کے مل منے کھانا پروں کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر تاجا بھندیوں  
کے پیکے پیجے نکال کر بھندیاں کھاتا رہا اور پھر گر جا کر بولا:  
”کہاں مر گئی ہے تو۔ پاس آ کر کیوں نہیں بیٹھتی۔“  
شریفان چپ چاپ پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”اب کیا ہولے؟“  
”کچھ نہیں۔“

”میں گلبرگ میں بھری ڈال کر آیا ہوں کسی معشوق کے گھر سے نہیں آیا۔“  
شریفان خاموشی سے اپنی گھٹ پر دھاگے کا آٹھ بناتی رہی۔

”بولتی کیوں نہیں۔“  
”بول تو رہی ہوں۔“

”ہنس کر کیوں نہیں بولتی۔“

سوکھے ملٹے کی پچاہن جیسی ممکناہست پیش کرنی ہوئی شریفان بولی:  
”تابے! اخلاق بڑی چیز ہے۔ شرافت بڑی دولت ہے۔ یہ جو کھے سواہ کھاتا ہے تو کسی  
اپنی دولت سے لکھ ہی پڑھا لے۔ جائز تو ہو سب کچھ۔“

”میں تیری طرح حرام حلال کے چکر میں نہیں پڑتا۔“

”میں سمجھ گئی ہوں تجھے۔ جیسی بیوی تجھے دکار تھی وسی میں نہیں ہوں۔ میں تجھے روکتی تھوڑی  
ہوں۔ جس سے بھی تو نہ کھے گا میں اسے بہن سمجھوں گہ شرع شرعاً ہے میں شرم کیسی؟“

"اوئے لاکھ تجھے کہا ہے میں سولتے تیرے کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔ کوئی ایکی بھی ہے تیری بن بننے والی۔ پر تو مجھ سے گناہ کرو کے رہے گی دوسرا شادی کا۔"

مُش سے پیش کا گلاس چوکی سے گرا اور فرش پر جھیل سی بی گئی۔

"تبے! خدا قسم مجھے تیرا بڑا انکر ہے۔ تو حق کرنے پر یوں لگی لگی ادارہ نہ پھر۔ اللہ رسول کے احکامات کو ان لے۔ دوزخ کی آگ سے بچ جائے گا۔ بنی اسرائیل نے کہا ہے....."

منزہ کی طرف اٹھا ہوا قمی مکملی سے باہر پہنچتے ہوئے تا جا اُنھوں نے اور گرج کر بولا:

"خدا قسم روٹی حرام کر دی تو نے۔ تجھے تو اسافی ہونا چاہئے تھا کسی پر امری سکول میں۔ کسی مولوی کے گھر ہونا چاہئے تھا۔ باسی تباہی روٹی کھانی تو عقل ٹھکانے رہتی تیری۔ ہزار بار کو جرانوالے سے تکے کتاب لایا تیرے لئے۔ بول کتنے کمانی دار چاؤ آئے تیرے لئے۔ قصوری میتھی، اندھے سے میردن کے حساب آئے۔ کئے کہ نہیں۔ جدھرڑک گیا میرا سونا تین لایا کہ نہیں تیرے لئے۔ پر تجھے تو تیرے اخلاق کی پڑی رہتی ہے۔ اپنی شرافت کی دھونس دے دے کر ذہر گھول دیا ہے میری زندگی میں۔ اس سے تو بتتر تقا تو کنجی ہوتی۔ بے عصمت مکرتی مجھے۔ کوئی دھننا تو نہ ہر تاہما سے دریان۔ جا، جا کے کمین من کالا کرپانا۔ خود بھی جی۔ مجھے بھی جینے دے۔ ایک بچھوڑ دس بیار بنا۔ خدا قسم جو مجھ سے ایسا ہی بیار ہے تو کسی غیر کے ساتھ سورہ میری خاطر۔ تیری بھی زبان بند ہو جلتے گی۔ میری ہر جگہ گاہ ہو کر۔ کسی یار کے ساتھ لکل جا دو چار دن کئے۔ پھر تم دونوں برابر تو ہو جائیں گے۔ کیوں مار رہی ہے مجھے غیر کی آگ میں جھوپک کر۔"

تاجا بولتا گیا اور بوتا بولنا کنڈی کھول کر باہر چلا گیا پر شریفان اپنی جگہ ہی مینچی گئی۔

بڑی دیر بعد اٹھی تو پچھے دھڑ میں عجیب قسم کا درد ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی تاجا ٹرک لے کر چلا جاتا وہ بڑے اطمینان سے گھر میں بیٹھی کام کا بچ میں معروف رہتی پر آج تو گر سے ہوئے گلاس سے بھی اسے خوف آ رہا تھا۔ کھڑے کھڑے جب پیروں میں سو ٹیاں پچھئے لگیں تو وہ اپنے ازابند کا اڈا لیکر کر لئے پر چڑھ گئی۔

نوہر کی نیم گرم دھوپ کمر پر دوئی گھنٹے پڑی اور گرمی سے چھڑ جلنے کی بوازے گئی تو وہ اُبھر کر ٹھنڈے تر نہیں میں جائیں گی۔ اس سے پہلے یوں نیچی منڈیوں والے کو ٹھنڈے پر وہ اتنی دیر کیجیے تاً آئی تھی۔ عجیب سامنہ تھا۔ دیوار کو تھجھ پہلاں کرادمی سیدھا نکروالی پر چون کی دکان سبک سینے سکتا تھا۔ بھلی کے کمپے کو ٹھوٹوں پر لگے نظر آتے تھے۔ اونچے مکانوں پر شیلی درازوں کے لگے ہوئے اٹیٹھے باٹوں سے بندھی ہوئی ڈریاں اور تاریں اور ان پر جھلے آسموں کی دھلی وحدانی شلواریں چور طرح چوپ پڑی تھیں۔ آسان بہت نیلا تھا اور اس رحلے آسمان میں چیلیں چھوٹی چھوٹی پنگوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔

پنافیں کیوں آج پہلی بار شریفان زادوں پرستی میں لیاں رکھے خالی الدہن سیئی تھی۔ سارے حرب ختم ہو چکے تھے۔ اس سے آگے کون سا راستہ ہے؟ اس سے آگے کونسی گلی کھلتی ہے؟ وہ بار بار لپٹنے آپ سے پوچھتے۔ پوچھتے پوچھتے اور سوچتے سوچتے جب اس کا ذہن خالی ٹبے کی طرح ہو گیا تو اس نے سامنے گناہ کر کے سارے حستے کے مکان سے لگے مکان کی منڈی پر پردہ بیٹھا شیو کر رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی کئی بار شریفان نے ایوب کو دیکھا تھا اسے معلوم تھا کہ ایوب مال کی ایک فیشن ایبل ڈرائی لکیز کی دکان پر بلازم تما اور اسی لئے سارے ملے میں اس کے پرستے اتنے ابھے ہی کرتے تھے پر کھلی آنکھوں اور خالی ذہن سے پہلی بار اس نے ایوب کا استقبال کیا۔ اور ایوب بھی خاباؤ کا نمارک میں جی حصوں کرتا کرتا تھا۔ نوہر کی دھوپ میں قائم یا چہرہ دیکھا تو اپی لکھ ک بھول گیا۔ ڈرائی لکینگ کی دکان پر بڑے بڑے پروں والی عورتیں فینائل کی خوشبو میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے گھنڑا یا کرفی تھیں۔ ان کے تیچھے تیچھے باوردی ڈرائیور بھی عموماً ہوا کرتے تھے۔ وہ دوپٹے کی رنگ کا تھا اور سوت کے ڈرائی لکینگ پر گوما اسکھ آنے یار دپکے کئے اس سے یا تو جھکڑتی تھیں یا اندر بٹ کرنے کے انداز میں بڑی فری بھی ہو جاتی تھیں۔ آج پہلی بار شریفان نہیں پر لیسی بیگانات میں سے ایک بھی تو نہیں تھیں۔ تو اس کا طریقہ نہ میسا ایسا تھا کہ ایوب مرغوب ہو جاتا۔

عید میلاد النبی کی رات تھی۔

برڈھیوں کی بھی جلا کر جب کوئے ہی کوئے شریفان ایوب کی برساتی میں پہنچی اور ایوب پنجے

سے اپنا بتراد ایک گاہک کی سانچ کی سمجھاں والا کبل لے آیا تو شریفان کو عجیب جرجھی سی آگئی۔  
کوئی شے پر صرف ایک اینٹ کی جالی دار دیوار کا پردہ تھا۔ بیان ڈھیلی چار پانی پر بتر جھاگ جبکہ  
دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے تو ایوب درد پدھی کی سازگری کی طرح کھلتا ہی چلا گیا۔

”تم بہت خاموش ہو شریفان۔“

سو اسوا اپنی پیکیں اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

شریفان کو ریل کے ڈبے جیسی یہ نیم چھتی، مڑک کے کھجے سے دماتی روشنی، قریب طے بازار  
سے پکنے والے دودھ کی خوشبو، ڈرانی گلین کئے ہوئے ایوب کے کپڑے اس بے عجیب قسم کی الجھن  
ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ ان سامے حالات میں ایک سننی خیر مساجکا نبی مل رہا تھا۔ اس سے پہنچ کی  
نامحرم سے بات کرنے کا اتفاق بھی کم ہوا تھا اور اب وہ دونوں اس طرح بڑے بیٹھ کر جیسے دو مردوں  
ساتھ ایک ہی شنی سے مُگے ہوں۔

”تمہیں مجھ سے محبت ہے شریفان۔“ ایوب نے بارہ ہوئی مرتبہ سوال کیا۔

اور شریفان نے اپنے دو پیٹے کی تاریں نکالتے ہوئے نظریں بھکالائیں۔

ابھی تک تابع کا ٹرک احاطے میں داخل نہ ہوا تھا۔ شریفان کے کان ادھر ہی کو لگے تھے۔ تباہ  
ہمیشہ ریس و سے کرٹک بند کرتا۔ جونہی رات گئے اس کا ٹرک احاطے میں گھستا دو تین گئے مسلسل  
بھونکنے لگتے اور برڈی دیر تک بھونکتے رہتے۔

”اب کیا سوچ رہی ہو شریفان؟“

شریفان نے ملٹے کی خشک چاہک جیسی مسکراہٹ پیش کر دی۔

”برڈی خاموش ہو تھم۔ جب کبھی میں تمہیں کوئی شے پر دیکھتا تھا تو سوچا کرتا کہ خدا جانے کیسی اداز  
ہے اس کی کسی باتیں کر قہے۔ کسی کس کا ذکر کر قہے اپنی باتوں میں۔ تم تو بالکل ہی خاموش فلم  
کی، بیر وٹن ہوو۔“

وہ آہستہ سے بولی: ”کیوں۔ کیا تمہیں چپ چاپ لوگ اچھے نہیں لگتے؟“

لگتے ہیں پر کریدی گئی جاتی ہے کہ وہ اندر ہی اندر کیا سوچ ہے ہیں۔ خدا کے نئے ایک بار کہہ دو تینیں مجھ سے مجتہ ہے۔ میں خدا قسم تمیں تلبے ہے سے چھین لوں گا۔ اس شرایمنی بد نجت ڈرائیور نے نہ تماری قدر ہی نہ جانی۔ کہاں مراہنہ ہے آدمی آدمی رات تک؟  
شریفان اب بھی چپ ہے۔ ایوب کے خیالات سے اس کو مکمل اتفاق تھا لیکن ان کا انعام کسی اور کے ہونٹوں سے برداشت کرنا اس کے لبس کی بات نہ تھی۔ اس نے منہ پر سے کر لیا اور غصے میں آئے ہوئے آنسو پہنچنے لگے۔

”بول شریفان۔ بول جانی۔ تجھے مجھ سے مجتنبے کہ نہیں۔“  
عید میلا دلبی کی رات کا پہلا پر تھا۔ مجھوں پر ابھی سے لوگ نعمتیں گانے لگنے لگے تھے۔ مشحاتی کی دکانیں نئے سماں جاری تھیں۔ بازار کی طرف سے رست بھے کا شور اٹھ رہا تھا۔ ایوب اور اس میں اب کوئی دوئی نہ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کے کان ابھی تک ڈر کی آواز پر لگے تھے۔  
”بول شریفان۔ اب تو ہم اک بیک ہو گئے ہیں۔ اب بھی تجھے مجھ سے مجتنبے نہیں ہوتی۔“  
ڈرک بہت آہستہ آہستہ مسجد کے پچھے احاطے میں داخل ہوا۔ نہ رہیں دیئے کی آواز آئی نہ کہ تجوہ نکلے۔ خدا جانے اس سوال کو پلے سے باندھ کر شریفان کس وقت اپنی میرڑھیوں میں آبیٹھی۔ میرڑھیوں میں مدھم سالب بروشن تھا۔ وہ میرڑھیوں پر جسی بیٹھی تھی جب تا جانگی میں آیا باہر کے دروازے کو تبا جا ہمیشہ خود مغلن کر کے جایا کرتا تھا۔ شریفان تلی پیک کر پیلی میرڑھی پر جھوپکی کی بیٹھی رہ گئی۔

آج تلبے کے ساتھ ایک غیر عورت بھی تھی۔ اس نے نسواری رنگ کا رقص چین رکھا تھا اور جپڑے پرستی گلابی اپنے شکل لگا کر کھی تھی۔

”کہاں ہے تو شریفان۔ دیکھو تو کیا سو نات لایا ہوں تیرے لئے۔ کہاں ہے تو شریفان۔ دیکھو اس کے بعد میں حرام نہیں کھاؤں گا۔“

تاجاوازیں دیئے جارہا تھا اور اندر کو ٹھرمی کی طرف اچک کہ دیکھو رہا تھا۔ میرڑھیوں کی

روشنی نسواری بر قعے والی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

کل سولہ سیڑھیاں ہی تو تھیں لیکن ابھی یہ سیڑھیں اترنے کی اسی میں ہم تھے نہ تھی۔ دشیا ڈار بند سے بندھا ہوا چاپوں کا چھوٹے بچے کے موٹ کی طرح دمری سیڑھی پر ڈکا ہوا تھا۔ کافنوں میں تباہ کی آواز رات کو جلا گئے والے جھینکر کی طرح ہو چنے اونچے کہہ رہی تھی:

”ایسا ہی تجھے مجھ سے پیار ہے تو ایک بار میری خاطر کسی غیر کے ساتھ سورہ۔ پھر تو مجھے بعد میں کچھ کہنے جو گی تو نہ رہ جائے۔ تو اور میں ایک سطح پر آکر پیار کر سکیں۔ کوئی دھنا نہ ہو، کار در میان۔ جا کہیں منہ کا کار کر آ۔ شریفان۔ نہ تو اتنی سفید ہوتی نہ مجھے ایسا وخت پڑتا۔ پھر تم میں سچا پیار ہوتا۔

سچا پیار۔“

تباہ رات کی خنک سردی میں نسواری بر قعے والی کھڑی تھی۔ تابعے کا ہاتھ اس کے کندھے پر تھا اور وہ اونچے اونچے پکار رہا تھا:

”شریفان! کمال ہے تو؟ بولتی کیوں نہیں۔ دیکھ تو اس بار میں تیر سے لٹکایا سو غالیا ہوں۔ کل سولہ ہی تو سیڑھیاں تھیں لیکن وہ جا گوٹھی گھر کی ٹانکی سے بیٹھ گئی تھیں تاکہ کئی جیسے بھری کلکلی میں کسی ساتھ نہ ہاتھ چھوڑ دیئے ہوں!

